مطبوعاتِ ادارہ

چند تبصرے

پلگرمیج آف ایٹرنٹی (منظوم انگریزی ترجمہ "جاوید نامہ") مترجم شیخ محمود احمد

ناشر: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور۔ سن اشاعت ۱۹۶۲ء

دبیز کاغذ۔ نفیس ٹائپ ضخامت ۸۷ صفحات قیمت: بارہ روپے۔

ادبی سرمایہ، زمان و مکان اور تخلیق و زبان کی بوقلمونی کے وصف بنی نوع انسان کی مشترکہ میراث ہے اور اس کے سرچشمے خواہ کہیں بھی پھوٹیں، تشنگانِ علم کے لیے کوئی امر سدِ راہ نہیں ہے۔ یہی ادبی سرمایہ ایک ایسی روایت ہے جس سے ہر دور میں فن کار اپنے اپنے ظرف کے مطابق روشنی حاصل کرتا ہے اور اس میں حسبِ توفیق اپنے جگر کا خون، دل کا نور شامل کر کے آئندہ نسلوں تک یہ مقدس امانت پہنچانے کی سعی کرتا ہے، دیکھنا صرف یہ ہوتا ہے کہ فن کار نے اس میراث سے اپنے خیالات کی شمعیں کیونکر فروزاں کی ہیں، اس کے ہاں نقطۂ نظر کا آفتاب کیسے طلوع ہوتا ہے۔ نئے معیار، نئی قدروں کی تشکیل کیونکر ہوتی ہے۔ ان حالات میں زندگی اور ادب کے قافلے کن نئی راہوں پر گامزن ہوئے ہیں۔ انسان اپنے عہد کے سماجی شعور، جذباتی، ذہنی، عملی اور فکری زندگی کو کس نئے آہنگ سے روشناس کرتا ہے۔

علامۂ اقبال مرحوم بھی ایسے ہی فن کار ہیں جن کے بارے میں حافظ کی ہمنوائی میں:

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما!

کہنا بالکل مناسب ہے۔ انھوں نے قریباً قریباً ہر چشمۂ فکر سے اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کی ہے اور ان تمام ادبی یادگاروں کو اپنے لیے مشعلِ ہدایت جانا ہے جو اُن کی اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں میں کمالِ فن کی سند رکھتی تھیں۔ اس ضمن میں جب اقبال گوئٹے کے دیوان اور

علامہ محمود شبستری کی شہرۂ آفاق مثنوی گلشنِ راز کا جواب "پیامِ مشرق" اور "زبورِ عجم" لکھ کر میراث فن کو جدت کی مختلف منزلوں سے روشناس کر چکے تو معراجِ رسول مقبولؐ کے اسرار و حقائق کی نقاب کشائی کی دیرینہ آرزو بیدار ہوئی۔ یہ ۱۹۲۹ء کا زمانہ ہے جن دنوں سرسید کا معراج کے بارے میں مخصوص نقطۂ نظر اہل نظر کو دعوتِ فکر دے رہا تھا۔ چنانچہ اقبال کے ذہن پر اس آرزو کی متواتر دستک تازیانہ بنی اور انھوں نے "معراج نامہ جدید" کی داغ بیل ڈالی۔ یورپ میں ان دنوں اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے کی کتاب "ڈیوائن کامیڈی" ہدفِ تنقید بن رہی تھی اور اربابِ فکر نے اس بات کا کھوج لگایا تھا کہ ڈیوائن کامیڈی کے آسمانی ڈرامے کے پلاٹ کا خمیر ان واقعات اور تفصیلی مناظر سے اٹھایا گیا ہے جو اسلام میں معراجِ محمدیہ کے متعلق بعض احادیث و روایات میں مذکور ہوئے ہیں یا بعد میں دیگر مشہور متصوفین اور ادبا کے سرمایۂ تحریر میں مندرج ہونے کے علاوہ ابن عربی کی تصنیف "فتوحاتِ مکیہ" میں بالتصریح ملتے ہیں۔

سرِدست ڈانٹے کی "ڈیوائن کامیڈی" اور اقبال کے "جاوید نامہ" کا موازنہ زیرِ نظر نہیں۔ تاہم اس قدر کہنے میں کچھ حرج نہیں ہے کہ جاوید نامہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک طرح ابن عربی کی "فتوحاتِ مکیہ" ابوالعلامعرّی کے رسالہ "الغفران" کا نقشِ ثانی بھی ہے۔ جہاں تک ہیئت کا تعلق ہے ابن عربی نے سیاحت علوی کے بیان کے لیے دو افراد کو وسیلہ بنایا ہے۔ ایک عالم دین اور دوسرا فلسفی ہے۔ اور ان کی زبان سے مختلف مسائل پر اس انداز سے بحث کی ہے کہ گویا تمام خیالات وانکشافات والہامات ہیں جو خود ان کے قلب پر اس معراج میں القا کیے گئے۔ ابوالعلامعرّی نے رسالہ "الغفران" میں اپنی بہشت اور دوزخ کی منظرکشی کے ساتھ رحمتِ خداوندی کی وسعت کو اجاگر کرنے کے لیے بدکار و گنہ گار شعرا کو جنھوں نے مرنے سے پہلے توبہ کر لی تھی مغفرت و رحمت کا سزاوار ہوتے اور جنت میں داخل ہوتے دکھایا ہے۔ اسی طرح ڈانٹے اور ابن عربی دونوں نے حیات بعدالموت کا سراغ لگانے کے لیے سات ستاروں کی سیر کی ہے۔ اقبال کے ہاں بھی ان کی سیاحت چھ ستاروں کے گرد

گھومتی ہے مگر یہاں دوزخ اور اعراف کا کہیں ذکر نہیں، مبتلائے عذاب شخصیتوں کے بیان کے لیے "خاک زحل" کے ایک خونیں قلزم کے منظر سے کام لے کر غدارانِ ملت کو ارواحِ خبیثہ کے روپ میں جو "ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن" ہیں دکھایا ہے۔ انھیں جہنم کی آگ نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

ان شواہد کے پیشِ نظر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اقبال نے مذکورۂ بالا ہر سہ فن پاروں کو سامنے رکھ کر جاوید نامہ کا خاکہ تیار کیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے ڈیوائن کامیڈی اور فتوحاتِ مکیہ کے برخلاف حیاتِ مطلق اور ان اقدار پر جو بالواسطہ بقائے حیاتِ انسانی کی ذمہ دار ہیں، توجہ مبذول کی ہے اور یہاں بھی اساسی مضامین وہی ہیں جو جابجا ان کی دیگر تحریروں میں ملتے ہیں البتہ یہاں ان کی شاعری ایک ڈرامائی کیفیت رکھتی ہے جس میں لَے اور صوت کو وہی آہنگ نصیب ہے جو تصویر کشی اور منظر آرائی کو ہے۔ چنانچہ فن کے اعتبار سے جاوید نامہ کی سادگی و پرکاری، بے خودی و ہوشیاری عجیب چیز بن گئی ہے۔

مرحوم کی بڑی خواہش تھی کہ جاوید نامہ کو کوئی عمدہ مصور ILLUSTRATE کر دے وہ آرزومند تھے کہ ان کا یہ شاہکار ان یورپین اقوام تک ضرور پہنچے جو ڈیوائن کامیڈی سے متعارف ہیں۔ انھیں اس بات کا قدرے افسوس تھا کہ ان کا زیادہ پختہ کلام فارسی زبان میں ہے۔ چنانچہ جب صوفی غلام محی الدین نے مرحوم سے اپنے ایک فاضل دوست کی اس خواہش کا ذکر کیا کہ وہ ان کے کلام کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرنا چاہتے ہیں تو اس وقت جاوید نامہ کچھ عرصہ پہلے معرضِ وجود میں آچکا تھا۔ مرحوم نے انھیں اپنے مکتوب محررہ ۳۱ مارچ ۱۹۳۳ء میں لکھا:

"باقی رہا یہ امر کہ کونسی نظموں کا ترجمہ کیا جائے سو عرض یہ ہے کہ بانگِ درا کی بیشتر نظمیں میری طالب علمی کے زمانے کی ہیں زیادہ پختہ کلام افسوس کہ فارسی زبان میں ہوا۔ بہتر طریق یہ ہے کہ بانگِ درا سے بعض نظمیں انتخاب کر لی جائیں باقی زبورِ عجم اور پیامِ مشرق سے انتخاب

کی جائیں۔

اس سے زیادہ اہم کام یہ ہے کہ جاوید نامہ کا تمام و کمال ترجمہ کیا جائے۔ یہ نظم ایک قسم کی DIVINE COMEDY ہے۔ مترجم کا اس سے یورپ میں شہرت حاصل کر لینا یقینی امر ہے۔ اگر وہ ترجمے میں کامیاب ہو جائیں، اور اگر اس ترجمے کو عمدہ مصور ILLUSTRATE بھی کر دیں تو یورپ اور ایشیا میں مقبول تر ہو گا۔ اس کتاب میں بعض بالکل نئے تخیلات ہیں اور مصور کے لیے بہت عمدہ مصالحہ ہے۔

ظاہر ہے کہ اقبال کے کلام کا یورپین اور دیگر ایشیائی زبانوں میں ترجمے کا احساس خود ان کے زمانے میں بیدار ہو چکا تھا۔ جن ادبی محسنوں نے اس کی طرف توجہ کی ان میں ڈاکٹر نکلسن، ڈاکٹر تاخیر، پروفیسر آربری اور کیرمین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر نکلسن کے بارے میں خود ڈاکٹر اقبال مطمئن تھے۔ ممکن ہے یہ اس لیے ہو کہ ڈاکٹر نکلسن کو جو سہولتیں میسر تھیں اس زمانے میں موجود نہیں ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں مترجمین اقبال خواہ عبد القدیر نیاز ہوں یا الطاف حسین ان کی کاوشیں قابل ستائش تو ہیں مگر اس قدر بھرپور نہیں۔ اقبال کی آفاقی شخصیت اور اس کے پیغام کی سرمدیت نے مختلف اقوام عالم کے مستشرقین کو ابھارا ہے اور اب تک جرمنی میں پروفیسر ہل، فرانس میں مادام ایومیورچ، اٹلی میں ڈاکٹر بوسانی، مصر میں عبد اللہ وہاب عزام مرحوم، چیکوسلاواکیہ کے مسٹر ہیٹرنک کے کارنامے اقبال کے ہموطنوں کو دعوت فکر دے رہے تھے۔ مقام شکر ہے کہ شیخ محمود احمد صاحب اقبال مرحوم کی دیرینہ آرزو کو جاوید نامہ کے منظوم انگریزی ترجمے کی صورت میں بر لا رہے ہیں۔ ترجمہ اور بالخصوص منظوم ترجمے کی دقتوں کا احساس صحیح طور پر صرف ان اہل علم کو ہو سکتا ہے جو اس منزل سے گذرے ہیں۔ ترجمے کا معاملہ جہاں انتہائی ذمہ داری کا حامل ہوتا ہے وہاں اس سے کما حقہ عہدہ برآ ہونا بہت مشکل ہے اور اقبال کے معاملے میں تو یہ ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔ اچھے ترجمے کی کسوٹی ناقدین ادب یہ بتاتے ہیں کہ اس پر ترجمے کا گمان نہ ہو، اور اس اعتبار سے شیخ محمود احمد صاحب